مذہبی مذاکرہ — اصول وآداب

بہ قلم: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی
شیخ الحدیث مدرسہ حسینیہ کایم کلم، کیرالا

دنیا کی موجودہ صورتِ حال گذشتہ ادوار سے بالکل مختلف ہے، آج دنیا کے اکثر حصوں میں الگ الگ بولی بولنے والے متضاد جادۂ فکر رکھنے والے، مختلف طرزِ زندگی اختیار کرنے والے اور جدا جدا راہِ عمل اپنانے والے مل جل کر بستے ہیں، دنیا میں چین وسکون کے ساتھ جینے کے لیے ملی جلی آبادی میں بسنے والے انسانوں سے راہ ورسم کو استوار رکھنا ازبس ضروری ہوتا ہے؛ کیوں کہ بسا اوقات نفرت وتشدد کا ماحول صرف دنیوی شب وروز کو ہی مکدر نہیں کرتا ہے؛ بلکہ دینی رجحانات وخیالات پر بھی برا اثر پڑتا ہے، پھر ہوتا یہ ہے کہ امن وسکون کا باغ وبہار رسہ کشی وتناؤ کا شکار ہوکر ویران ہوجاتا ہے۔

اس صورتِ حال سے پہلے بھی انسان دوچار تھا؛ مگر محدود پیمانے پر، جب سے مشینی دور کا آغاز ہوا اور دنیا کی پھیلی ہوئی آبادی سمٹ کر ایک آئینہ میں نظر آنے لگی تو ہر خوشی وناخوشی بین الاقوامی بن گئی، اب ایک جگہ کا دکھ ہر جگہ محسوس کیا جاسکتا ہے اور ایک جگہ کی خوشی ہر حصہ میں جشن کا ماحول بنادیتی ہے؛ لیکن کرب ودرد کی داستان کے مقابلہ میں خوشی ومسرت کی خبریں کم ہوتی ہیں؛ اس لیے پوری دنیا ایک درد اور ایک ہی کرب کی شکار معلوم ہورہی ہے، جس سے ناخوش گوار ماحول ہر مکان ومکین پر چھاچکا ہے، اس کی کڑواہٹ کو کم کرنے یا مٹانے میں مذاکرات وباہمی تبادلۂ خیال کو خاص طور پر کلیدی کردار ادا کرنے والا اور اساسی میز سمجھا جانے لگا ہے۔ اس میں بہت حد تک تیزی آئی ہے، کچھ تو اسلام دشمنوں، خاص طور پر کیتھولک کلیسا کی سوچی سمجھی سازش کو بھی اس کے کردار میں دخل رہا ہے؛ اس لیے کسی بھی قسم کا مذاکرہ منعقد کرتے وقت ایک مسلمان کو بہت ہی حساس رہنے کی ضرورت ہے، ایسا نہ ہو کہ دشمنانِ اسلام کی دسیسہ کاری کی نذر اسلام کا دعوتی نظام ہوجائے اور اسی میں الجھ کر اصل مقصد سے دور ہوتے چلے جائیں، نیز کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا تشخص اور اپنی شناخت ہی سے ہاتھ دھونا

پڑ جائے۔ افہام وتفہیم کے بجائے خود مرعوبیت کا شکار ہوکر خرمنِ اسلام کو تاخت وتاراج کرنے کی جدوجہد شروع کریں؛ اللہ تعالیٰ ان سب سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے، آمین!

پوری حساسیت، بے دار مغزی، شریعتِ اسلام سے بے پناہ محبت ولگاؤ کے جذبہ اور دینِ اسلام کی حقانیت وصداقت کا بھرپور یقین رکھ کر اس میدانِ خاردار میں ایک مومن کو قدم رکھنا چاہیے، تب ہی نتیجہ خیز اور امید افزا فضا استوار ہو پائے گی۔

مذاکرہ سے مقصود دوسروں کو مطمئن کرنا اور ان کے ذہنی خلجان کو دور کرنا ہوتا ہے، اسی کو افہام وتفہیم بھی کہتے ہیں، اسی کے قریب قریب مناظرہ بھی ہے، جس میں مخاطب کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا ہے، کوئی ضروری نہیں ذہنی طور پر اسے اطمینان بھی حاصل ہوجائے، مناظرہ بھی بعض اوقات مفید ثابت ہوتا ہے، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے ایک ضروری ومضبوط حربہ ہے، ہمارے بزرگوں نے بھی اس میدان میں قدم رکھ کر اسلام اور تعلیماتِ اسلام کو خوب سربلند کیا ہے۔ ان کے مناظرانہ کارنامے بہت دنوں تک اور بہت دور تک گلی کوچوں تک میں لوگوں کے چرچے کا موضوع بنے رہے۔ اب چرچہ کم ہوکر کتابوں کی زینت ہیں؛ لیکن کچھ مدت پہلے سے دیکھا رہا ہے کہ میدانِ عمل کا یہ سنہرا باب ''مناظرہ'' میدانِ مباحثہ کا ادبی وخطابی اکھاڑہ ہوکر رہ گیا ہے؛ بلکہ باطل تشدد کو بھڑکانے میں مددگار ثابت ہورہا ہے؛ اس لیے اس کے بجائے مذاکرہ وباہمی تبادلۂ خیال کا طریقہ اختیار کیا جانے لگا، اس سے اسلام کو کتنا نفع ہوا اور کتنا نقصان ہوا، اس سے بحث نہیں بظاہر اتنا فائدہ نظر آتا ہے کہ بیمار سماج کی غلط فہمی سے بہت حد تک ذہن صاف ہوجاتا ہے اور دل حقیقت کو قبول کرلیتا ہے، خواہ اس کا برملا اظہار کرنے میں ہچکچاہٹ باقی رہ جائے۔

اسلامی تاریخ سے واقف حضرات سے یہ مخفی نہیں ہے کہ اسلام کی نشر واشاعت میں افہام وتفہیم پر کافی زور دیا گیا ہے، نزولِ وحی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ شروع ہوگیا، کفارِ مکہ بالخصوص خاندانِ نبوت کے مختلف قبائل وافراد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفت وشنید، پھر اسلام لانے والوں کے سامنے اسلام کی دعوت، نتیجتاً لوگوں کا پس وپیش کرنا، سب مذاکرہ کے وسیع مفہوم کے تحت آتا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر قبائلِ عرب جن خدشات میں مبتلا تھے، ان خدشات کو عروہ بن مسعود ثقفی ودیگر حضرات نے باہمی مذاکرہ میں فصیح وبلیغ لب ولہجہ میں بیان کیا تھا، مذاکرہ کی مشروعیت پر اس کو دلیل بنایا جاسکتا ہے، امام بخاریؒ نے طویل حدیث ذکر کی ہے، عروہ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

أَیْ مُحَمَّدُ! أَرَأَیْتَ إِنِ اسْتَأْصَلْتَ أَمْرَ قَوْمِكَ، هَلْ سَمِعْتَ بِأَحَدٍ مِنَ العَرَبِ اجْتَاحَ أَهْلَهُ قَبْلَكَ، وَإِنْ تَكُنِ الأُخْرَى، فَإِنِّي وَاللَّهِ لَأَرَى وُجُوهًا، وَإِنِّي لَأَرَى أَوْشَابًا

مِنَ النَّاسِ خَلِيقًا أَنْ يَفِرُّوا وَيَدَعُوكَ الخ. (بخاری شریف:۱/۳۷۸،کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد)

(اے محمد! ذرا بتایئے اگر آپ نے اپنی قوم کو نیست و نابود کر ہی دیا تو آپ نے کسی عربی کے بارے میں سنا ہے کہ اس نے آپ سے پہلے اپنی اصل کو ہی کر دیدیا ہو، اگر صورتِ حال دوسری ہو تو بخدا میں آپ کے پاس مختلف قبائل کے افراد دیکھ رہا ہوں یہ لوگ فرار اور آپ کو چھوڑ دینے کی ذہنیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں)

عام الوفود میں یمن کے نصاریٰ کی جماعت دربارِ رسالت میں حاضر ہوئی جو کتابوں میں ''وفد نجران'' سے معروف و مشہور ہے۔ یہ وفد اہل لوگوں کا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت طویل مذاکرہ و مکالمہ کیا ہے، انھوں نے مسجد نبوی میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کے بجائے بیت اللحم کا استقبال کر کے اپنی عبادت بھی ادا کی ہے، اللہ کے رسول نے منع کرنے سے صحابہ کو روک دیا؛ کیوں کہ ان کی شریعت میں ایسا ہی تھا۔ (فقہ السیرۃ للغزالی: ۴۵۹-۴۶۳)

ان مذاکرات کا سلسلہ بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا اور ہنوز جاری ہے۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مسلمان کو دوسروں سے کن موضوعات پر مذاکرہ کرنے کی گنجائش ہے، نیز ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے کہ مذاکرہ اپنے صحیح اور اصلی مقصد تک پہنچ سکے، اسی طرح کیا طریقہ کار ہو جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اسلام اور اس کی پاکیزہ تعلیمات سے مانوس کر کے باطن کو جھنجھوڑ سکے۔

مذاکرہ کے موضوعات

چوں کہ مذاکرہ کا مقصد دعوت و تبلیغ کی فضاء ہموار کرنا، اسلام و اسلامی احکام کے تئیں پائے جانے والے خدشات کا ازالہ، غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات کا سازگار بنانا اور حق کی صحیح تفہیم و دل نشیں تشریح ہے؛ اس لیے اس کا موضوع سماجی و سیاسی کے علاوہ مذہبی بھی ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کفار و مشرکین سے جو مکالمات ہوئے ہیں، ان میں کفار کی نیت کچھ بھی ہو؛ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت بہر حال افہام و تفہیم کے لیے ہی تھی۔ ایک موقع پر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی عجلت کے ساتھ ایسی مجلس میں پہنچے، جس میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن الحارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن مطلب بن اسد، زمعہ بن اسود، ابوجہل، امیہ بن خلف کے علاوہ اور بھی شرفائے قریش جمع تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذاکرہ کی دعوت دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے ہی معلوم ہوا فوراً ہی مجلس میں رونق افروز ہوئے، ان حضرات نے اپنی بات رکھی:

’’آپ نے اپنی اس دعوت سے جماعتوں میں تفرقہ ڈال دیا ہے، سب کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا، باپ ودادا والا موروثی دین کا کچا چٹھا نکال دیا ہے۔ آخر کیا مقصد ہے؟ اگر مال کا حصول مقصود ہے تو ہم اتنا مال جمع کیے دیتے ہیں کہ آپ سب سے زیادہ مالدار تصور کیے جائیں، اگر سیادت وقیادت کی خواہش ہے تو ہم سب آپ کو قائد وحاکم ماننے کے لیے تیار ہیں، اگر کسی حسین وجمیل خاتون سے شادی چاہیے تو ہم اس کے لیے کوشش کرتے ہیں، یا اگر کسی قسم کی بیماری کا یہ اثر ہے تو ہم سب مل کر علاج کرادیتے ہیں‘‘۔

گویا کہ ان سرداروں کو دعوتِ اسلام کی بابت کچھ غلط فہمیاں واقعتاً تھیں یا انھوں نے بناوٹی انداز میں ظاہر کیا تھا۔ اللہ کے رسول نے ان کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

مَا بِی مَا تَقُولُونَ، مَا جِئْتُ بِمَا جِئْتُكُمْ بِهِ أَطْلُبُ أَمْوَالَكُمْ، وَلَا الشَّرَفَ فِيكُمْ، وَلَا الْمُلْكَ عَلَيْكُمْ، وَلَكِنَّ اللَّهَ بَعَثَنِي إِلَيْكُمْ رَسُولًا، وَأَنْزَلَ عَلَيَّ كِتَابًا، وَأَمَرَنِي أَنْ أَكُونَ لَكُمْ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۳۶، مطبوعہ: دارالخیر)

ترجمہ: جو کچھ آپ لوگوں نے کہا ان میں سے کوئی بات نہیں ہے، میں آپ حضرات سے نہ تو مال کا مطالبہ کرنے کے لیے حاضر ہوا اور نہ ہی شرافت وسیادت مطلوب ہے؛ لیکن میں آپ کے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، مجھ پر کتاب نازل ہوئی، مجھے اللہ نے حکم فرمایا ہے کہ میں آپ کے لیے جنت کی بشارت دینے والا اور جہنم سے ڈرانے والا بنوں۔

اس طرح کے اور بھی مکالمات ہیں جو مذہبی مذاکرہ کے جواز پر دلالت کرتے ہیں؛ لیکن مذہبی مذاکرہ ایک خاردار وادی ہے یہاں بڑی احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ نہ تو ہر کس وناکس کو اس میں گھسنے کی اجازت ہوسکتی ہے اور نہ ہی ہر وقت صرف مذاکرہ مذاکرہ کا نعرہ لگا کر اصل دعوتی مشن سے کنارہ کشی اختیار کی جاسکتی ہے؛ اس لیے:

(الف) ضروری ہے کہ مذاکرہ کرنے والے افراد پہلے تو دین اسلام کے ہر گوشہ سے پورے طور پر بصیرت کے ساتھ مطمئن ہوں ورنہ جس کو خود شرح صدر نہ ہو، وہ دوسروں کو کیا اطمینان دلاسکتا ہے، ’’خفتہ را خفتہ کے کند بیدار‘‘ بلکہ خدانخواستہ دوسری جانب کا پلہ بھاری پڑ گیا اور شکوک وشبہات سے اس کے ذہن کو الجھا دیا گیا تو مذاکرہ کا فائدہ تو کجا اس کے مضر اثرات سماج میں پھیل جائیں گے۔

(ب) نیز یہ بھی ضروری ہے کہ جن حضرات سے مذاکرہ ہو رہا ہے، ان کے مابین جن کتابوں کو مقدس سمجھا جاتا ہے، ان کے اس حصے پر کم از کم قابو یافتہ ہو جو ہمارے دین اور ہماری شریعت کے مزاج ومذاق سے ہم آہنگ ہو؛ بلکہ دین وایمان کی ان سے تائید ہو رہی ہوتا کہ وقت پڑنے پر ان کو

پیش کیا جاسکے؛ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہر طرح کی تحریف کے باوجود ابھی بھی ان کتابوں میں ایک معتد بہ حصہ ایسا ضرور پایا جاتا ہے، جو اسلام کی تائید کے لیے کافی ہے، حتی کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب گیتا، رامائن، وید وغیرہ میں بہت سے اشلوک ودفعات اس بابت موجود ہیں۔

(ج) یہ بھی لازم ہے کہ مذاکرہ صرف رسمی ورواجی نوعیت کا نہ ہو اور نہ ہی خودغرضی وخودنمائی کے داعیہ سے ہو، ورنہ دین کے بجائے دنیا بن کر رہ جائے گا۔ آخر اسی ہندوستان میں کچھ صدی پہلے ابوالفضل وفیضی، عبداللہ سلطان پوری وملا مبارک جیسے علماء کے بحث ومباحثہ اور اظہارِ برتری، ریا ونمائش نے اسلام کے خرمن کو خاکستر کرکے ''دینِ الٰہی'' کے نام سے ناپاک نظام کو جنم دیا تھا، جس کی اصلاح وتجدید کے لیے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ اور ان کے رفقا کو کتنی جانفشانی برداشت کرنی پڑی اور ایک طویل عرصے کے بعد ''عالمگیر اورنگ زیب'' کے زمانے میں صحیح اسلام کی ضیاپاشی ہوسکی؛ اس لیے نیک جذبات، مکمل وثوق واعتماد، یقین کامل، مضبوط اعتقاد اور عمل وکردار سے لیس ہوکر اس میں شامل ہونے سے بامقصد اور مؤثر مذاکرہ وجود پذیر ہوسکے گا۔

دوسروں پر تنقید کے حدود

مشرکانہ عمل اور معصیت کے کام سے ایک مومن کے لیے سمجھوتہ تو ممکن نہیں؛ بلکہ مذاکرہ کا مقصد ہی ان کو ایسے اعمال سے باز رکھنا اور مثالی ماحول برپا کرنا ہے؛ البتہ دعوتی اصول وضوابط کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

(ا) دعوت کا کام احکام سنانا ہی نہیں؛ بلکہ ان پر عمل کرنے کی طرف بلانا ہے، لہٰذا بلانے کے تمام اصول وضوابط کو اپنایا جائے گا۔ بلانا اسی وقت موثر ہوتا ہے؛ جبکہ مخاطب کو بلانے کے انداز سے وحشت اور نفرت نہ ہو، نیز اس میں استہزاء وتمسخر کا پہلو نہ ہو، ورنہ اولِ وہلہ میں ہی مخاطب بدک جائے گا۔

پیغمبرانہ دعوت کی یہی شان تھی، لوگوں کی طرف سے خواہ کتنا بھی مذاق اڑایا گیا، دین ومذہب پر فقرے کسے گئے، ذاتیات تک پر حملہ کیا گیا، قومِ نوح اپنے پیغمبر کو خطاب کرکے کہہ رہی ہے: إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْن (ہم آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں) مگر پیغمبر کا جواب بس یوں ہوتا ہے: يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلَالَةٌ وَلٰكِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ (میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں، میں تو رب العالمین کا رسول وقاصد ہوں)

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا انداز کتنا دل آزار ہے: إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ

مِنَ الْکٰذِبِینَ (ہم تو آپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تو فرعون اور اس کی قوم نے حد کردی، فرعون کہتا ہے: کون رب العالمین؟ اللہ کے پیغمبر نے جب رب السماوات والارض کہہ کر اپنے موقف کا اظہار کیا تو فرعون نے استہزار کرتے ہوئے کہا: أَلَا تَسْمَعُونَ (لوگو! سن رہے ہو) کیسی بے عقلی کی بات کررہے ہیں، حضرت موسیٰ نے اس کا کوئی بُرا اثر نہیں لیا اور اتنا کہا: رَبُّکُمْ وَرَبُّ آبَائِکُمُ الْأَوَّلِینَ (تمہارے اور تمہارے باپ داداؤں کا رب وہی ہے) تو فرعون جھلا کر کہتا ہے: إِنَّ رسولَکُمُ الَّذِيْ أرسِلَ إِلَیْکُم لَمَجْنُوْن (تمہارا رسول تو مجنون و دیوانہ معلوم ہوتا ہے) لیکن پیغمبر اُن سب سے بے پرواہ ہوکر کہہ رہے ہیں: رَبُّ الْمشْرِقِ وَالمَغْرِب وَمَا بَیْنَهُمَا إِنْ کُنْتُم تَعقِلُوْن (وہ رب مشرق ومغرب کا ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو)

خاتم الانبیار کو دعوت کی راہ میں کتنا کچھ کہا گیا! ساحر و دیوانہ کے لقب سے تو کبھی شاعر و کاہن سے یاد کیا گیا؛ مگر آپ نے کبھی استہزار کا جواب استہزار سے نہیں؛ بلکہ پیار و محبت سے دیا۔ استہزار و تمسخر کا ردِعمل بعض اوقات بہت مضر ثابت ہوتا ہے اور فتنہ کا باب کھول دیتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے دل آزار انداز اختیار کرنے سے سختی سے منع کیا ہے:

وَلَا تَسُبُّواْ الَّذِینَ یَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَیَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَیْرِ عِلْم (الأنعام:۱۰۸) (اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا، پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے)

اس آیت کے تحت مشہور مفسر جصاص لکھتے ہیں:

اس میں اس پر دلیل ہے کہ اہلِ حق پر ضروری ہے کہ ان بے وقوفوں کو برا بھلا کہنے سے باز رہیں جو ردِعمل کے طور پر اللہ کو برا بھلا کہنے پر بہت جلد اتر آتے ہیں؛ کیوں کہ یہ معصیت پر برانگیختہ کرنے کے مرادف ہے۔ (احکام القرآن ۹/۳۰ مطبوعہ: دارالفکر)

مشہور مالکی مفسر علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

علمار نے فرمایا: اس کا حکم اس امت میں ہر وقت باقی ہے، پس جب کافر قوت میں ہو اور خوف ہو کہ وہ اسلام یا نبی علیہ السلام یا اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہے گا تو مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ ان کے صلیبوں، دین، عبادت گاہوں کو برا بھلا کہیں اور نہ ان چیزوں سے تعرض کریں جو مذکورہ برائی تک پہنچائے؛ اس لیے کہ یہ معصیت پر برانگیختہ کرنے کے مرادف ہے۔ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۲۸/۴ سورۂ انعام)

(۲) قرآن کریم نے دعوت کے اصول میں ''حکمت'' پر خاص طور پر توجہ دی ہے، حکمت کی تفسیر وتشریح کا حاصل یہ ہے کہ جو بات کہی جارہی ہے، وہ مبنی برحقیقت ہو اور انداز ایسا اختیار کیا جائے جو دل میں اتر کر قبول کرنے کی اپیل کرے۔ دل میں اترنے کے لیے حالات کے تقاضوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے، ہر ایک سے گفتگو کا انداز یکساں نہیں ہوگا، مذاکرہ میں حصہ لینے والے بعض افراد آخرت کے قائل اور وجودِ صانع کے معترف ہوں گے تو بعض خالص مادہ پرست، آخرت کے تصور سے بے گانہ، صانع وخالق کے وجود ووجوب کے منکر ہوں گے، مزاج ومذاق کے اعتبار سے بھی مختلف ہوں گے، بعض بے جا تشدد وتعصب کے گھناؤنے مرض میں مبتلا، تو بعض سادگی ونرمی کے لبادہ پوش ہوں گے۔

بہرحال پہلے تقاضائے وقت اور اشخاص وافراد کے احوال سے آشنا ہونا ضروری ہے، پھر جہاں تشدد کی ضرورت ہو تو تشدد کو بروئے کار لایا جائے؛ لیکن جہاں نرمی سے کام چل رہا ہو تو نرمی برتی جائے؛ بلکہ جہاں تک ہوسکے تشدد کے بجائے سنجیدہ وشائستہ لب ولہجہ، محبت سے بھرا انداز اختیار کیا جائے، قرآنِ کریم نے مکالمہ کے موقع پر خاص طور پر ''احسن طریق'' اختیار کرنے کی تلقین کی ہے: **وَلَاتُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن** (اہلِ کتاب سے مجادلہ احسن انداز میں کرو) حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے پاس بھیجا گیا تو خاص طور پر حکم دیا گیا: **قُوْلَا لَهُ قَوْلاً لَيِّنًا** (ان سے بات کرنے میں نرم گفتاری اختیار کیجیے)

اسی شیریں انداز سے اسلام کا دائرہ وسیع ہوا۔ حلقہ بگوش اسلام کے حالات کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہوگی کہ ان کو متاثر کرنے میں سختی سے زیادہ شائستگی وحرفِ شریں نے کردار ادا کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص وصف امتیاز، نرم گفتاری اور کریمانہ اخلاق کو بیان کیا ہے۔

لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ یک گونہ تشدد کو بھی راہ نہ دیا جائے؛ بلکہ بوقت ضرورت کچھ سخت کلام بھی اپنا کام کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن مسعود ثقفی ودیگر سردارانِ حجاز سے صلح حدیبیہ کے موقع پر جو تبادلۂ خیال کیا، ان میں اللہ کے رسول ﷺ نے آخر میں یہ بھی فرمایا:

وَإِنْ هُمْ أَبَوْا، فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأُقَاتِلَنَّهُمْ عَلَى أَمْرِي هَذَا حَتَّى تَنْفَرِدَ سَالِفَتِي، وَلَيُنْفِذَنَّ اللَّهُ أَمْرَهُ (بخاری:۱/۳۷۸، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد)

ترجمہ: اگر وہ حضرات انکار کرتے ہیں تو خدا کی قسم میں، ان سے اس امر پر قتال کروں گا؛ تا آں کہ میری گردن الگ ہوجائے یا اللہ تعالیٰ اپنے امر کو نافذ وغالب کردے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تیکھا انداز غیر مناسب ہے تو دبا دبا لب ولہجہ اور مرعوبانہ گفتار بھی بعض اوقات مناسب نہیں کہ مخالفین جری ہوجائیں اور سمجھنے لگیں کہ مسلمانوں کے پاس شاید ٹھوس اقدام کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔

(۳) تیسری اہم پیش رفت ''موعظتِ حسنہ'' کے ساتھ ہونی چاہیے، اس کا سادا سا مفہوم ہے کہ مخاطبین کو باور کروانے کی حتی الامکان کوشش کی جائے کہ جو کچھ کہا جارہا ہے، وہ خیر خواہی کے جذبہ سے کہا جارہا ہے خودغرضی وخودنمائی مطلوب نہیں ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ملفوظات میں اس پر بار بار زور دیا ہے کہ بات اچھی ہو، کہنے کا انداز اچھا ہو، نیز نیت خیر خواہی کی ہو تو یقیناً وہ بات متاثر کرے گی۔

اس لیے ان کے سامنے حق کے فضائل اور اس کے خلاف کرنے کی صورت میں جو وبال آسکتا ہے عقلی ونقلی ہر طرح سے رکھ دیا جائے، انبیائے کرام کی دعوت میں جابجا قوم کو ''یاقومی'' اے میری قوم، اے میرے بھائی، سے خطاب کیا گیا ہے، اس میں یہی راز پنہاں ہے کہ مخاطب کو یقین آجائے کہ ہم سے گفتگو کرنے والا بھائی مان کر مخاطب ہورہا ہے، اس سلسلہ میں اگر مخاطب قوم کے بزرگوں اور رشی منیوں کی مقدس کتابوں سے ان امور کو ان کے سامنے رکھا جائے جو اسلام کے موافق ہیں تو ''خیر خواہ'' ہونے کا تصور پختہ ہوجائے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم کو جب دعوتی خط روانہ کیا تو اس میں جہاں اس کے جاہ ومنصب کا لحاظ رکھا، وہیں ایک متفق علیہ امر کا ذکر کرکے ان کو قریب کرنے کی کوشش فرمائی۔

(۴) اعترافِ حق: اگر شرکاء کی طرف سے کوئی حق بات آتی ہے تو اس کا بھرپور استقبال کیا جائے اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا اعتراف کیا جائے، اس سے قبولِ حق کے لیے ماحول سازگار ہوتا ہے۔

(۵) مذاکرہ اگر کسی وجہ سے ناکام ہوجائے تو ایسے موقع پر سنجیدگی ومتانت کا مظاہرہ کیا جائے، بے جا الزام تراشی سے احتراز کرتے ہوئے **لکم دینکم ولی دین** کا سہارا لے کر ساری باتوں کو انگیز کیا جائے؛ تاکہ آئندہ کے لیے موافق حالات پیدا ہوسکیں۔

ان امور کی رعایت سے ان شاء اللہ مذاکرہ وتبادلۂ خیال کا خاطر خواہ فائدہ برپا ہوسکتا ہے۔ ورنہ مذاکرے ہوتے رہیں گے؛ لیکن مسئلہ جہاں کا ہے وہیں رہے گا، ہر شخص اس صور میں پھونک مارنے کے لیے بے تاب ہوگا؛ مگر اس پھونک سے دنیا تو کجا اردگرد میں گونج پیدا نہ ہوسکے گی۔

❁ ❁ ❁